ڈاکٹر رشید امجد

جدید ادب میں پاکستانیت کا شعور

The emergence of Pakistan on the map of the Indian subcontinent was a turning point in the political and social life of the area. The literature produced in the area known as Pakistan carries a stamp of its own and possesses a peculiar temperament and intellectual innovasion. So many factor various influences have played their role in giving it a certain shape. The mor importanta of these is the Pakistani consciousness and its relevant aspects. All the literary movement carried the elements of this basic mould and has bestowed a unique wholesomeness to all creative writing.

تقسیم ہند کے ساتھ جب ایک نیا ماحول پیدا ہوا تو اردو ادب کے مزاج میں کئی قیمتی تبدیلیاں رونما ہو گئیں۔ پاکستان کا قیام انتہائی پرامن حالات میں نہیں ہوا تھا۔ تقسیم کی فضا تو ۱۹۴۶ء کے عرصے میں پیدا ہوئی، وہ پروان چڑھتی رہی اور جب دو آزاد مملکتیں وجود میں آ گئیں تو اس کے ساتھ فسادات پھوٹ پڑے۔ یہ فسادات اپنے ساتھ آگ اور خون کی ہولی لے کر آئے جو پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ دونوں طرف نقصان ہوا۔ قتل و غارت گری، لوٹ مار، عصمت دری اور اغوا کے ایسے ہولناک واقعات

Scanned by CamScanner

ہوئے جن کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

ان تمام عوامل کا اثر ادب پر پڑنا لازم تھا۔ فسادات کا یہ ادب زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا۔ جذبات کا دریا اترا تو ایسی تخلیقات بھی سامنے آنے لگیں جن میں فرقہ وارانہ تصادم کی کہانیاں تھیں۔ لیکن تقسیم ہند کے عواقب اتنے گہرے تھے کہ پاکستانی ادب کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر چکا ہے کہ آج بھی ہم اپنے ادب پر اس کے اثرات بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ تقسیم ہند سے محض فسادات کا ادب ہی پیدا نہیں ہوا، کچھ اور نئے عوامل بھی اس کا حصہ ہے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں کے ہاں وہ دکھ بھی اجاگر ہوا جو نقل مکانی کے باعث فطری طور پر ان کے اندر پیدا ہوا تھا۔

قیام پاکستان کے پیچھے برصغیر کے مسلمانوں کے وہ خواب پوشیدہ تھے جو ہندو اکثریت کی موجودگی میں تعبیر نہ پا سکتے تھے۔ توقع یہ تھی کہ پاکستان بننے کے بعد یہ خواب پورے ہوں گے مگر تقسیم ہند کے فوراً بعد کے سیاسی خلفشار نے ایسا ماحول پیدا کیا کہ سب خواب ابتدا ہی میں چکنا چور ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم کے بعد فسادات کے ادب کے ساتھ ساتھ مایوسی کا ایک عنصر بھی ہمیں اپنے شعر و ادب میں شامل دکھائی دے جاتا ہے۔

قیام پاکستان کے وقت تک ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ یہ تحریک بنیادی طور پر سماجی انصاف کی تحریک تھی اور ایک غیر طبقاتی سماج کا خواب دیکھتی تھی۔ لیکن تقسیم سے قبل اس نے انگریزی سامراج کے خلاف جدوجہد کا بیڑا بھی اٹھا رکھا تھا۔ اب جب پاکستان بن گیا تو نئے مسائل کو ایک نئے زاویہ نظر کی ضرورت تھی۔ انگریزی سامراج رخصت ہو چکا تھا۔ سماجی انصاف اب بھی ایک بنیادی ضرورت تھی لیکن پاکستان میں رونما ہونے والے سیاسی خلفشار کے باعث ایک نیا عامل بھی پیدا ہو گیا تھا اور وہ عامل خود پاکستان کے وجود کا تحفظ تھا۔ تقسیم سے قبل کانگریسی لیڈروں نے اکثر یہ دعویٰ کیا تھا کہ پاکستان اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکے گا۔ بعض ذہنوں میں اب یہی تشویش سر اٹھانے لگی تھی۔

سوال یہ تھا کہ پاکستان کا تحفظ کیسے ممکن ہو؟ کچھ لوگوں کے نزدیک اس تحفظ کی ضمانت نظریۂ پاکستان کے تحفظ میں پوشیدہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ادیبوں کا ایک ایسا گروہ سامنے آیا جنہوں نے نظریۂ پاکستان اور اسلام کو پاکستانی ادب کا محور و مرکز بنانے کی ترغیب دی۔ پاکستانی اور اسلامی ادب کی تحریکیں اس کا ایک ثبوت ہیں۔ یہ تحریکیں تو زیادہ دیر برقرار نہ رہیں لیکن ہماری تنقید میں نظریۂ پاکستان کا ذکر بڑھ گیا۔ تخلیقی ادب پر تو اس کے اثرات زیادہ نہیں پڑے لیکن جو نئی نسل ادب میں آئی، وہ بحیثیت مجموعی ترقی پسند تحریک سے دور ہوتی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حقیقت پسندانہ زاویہ نگاہ جو تقسیم ہند سے قبل اردو ادب میں موجود تھا، معدوم ہونے لگا اور اس کی جگہ رومانویت کا رجحان اثرانداز ہونے لگا۔ ترقی پسند تحریک پر پابندی کے ساتھ تخلیقی ادب میں قدرے جمود کی کیفیت پیدا ہو گئی اور جب 1958ء میں مارشل لا نافذ ہوا تو حقیقت نگاری کو بہت نقصان اور ضعف پہنچا۔ نئے حالات میں بیانیہ اور حقیقت نگاری میں کئی طرح کے خطرات پوشیدہ تھے۔

اس طرح ہم جب اپنے ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ جاننے میں دشواری نہیں ہوتی کہ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی تخلیقی سطح پر ادب میں ایک خاص طرح کا زوال پیدا ہوا جو 1960ء تک اپنے عروج پر پہنچا۔ جبکہ تنقید میں ترقی پسندی کے نقطہ نظر میں بھی 1947ء کے بعد کمی آتی گئی اور بعض دوسرے مذہبی یا اخلاقی نظریات فروغ پاتے گئے۔ یوں 1960ء کی دہائی تک یہ اندازہ ہو گیا کہ ادب کو کسی ایسی تبدیلی کی ضرورت ہے جو صورتحال کی مکاسی بھی کر سکے اور ہر طرح کے تخلیقی امکانات کو بھی سامنے لا سکے۔

یہ صورتحال ایک زمانے میں مغرب میں بھی پیدا ہوئی تھی لیکن وہاں ایک تحریک کے خاتمے کے بعد دوسری تحریک اور ایک فکر کے بعد دوسری فکر جگہ لیتی رہی۔ لیکن ہمارے ہاں پچاس کی دہائی تک تبدیلی کے آثار دکھائی نہیں دیتے جبکہ کسی ایسے انقلابی رویے کی ضرورت تھی جو کسی نئے راستے کی بنیاد ڈال سکے۔ قرۃ العین حیدر نے اسی صورتحال میں یہ

Scanned by CamScanner

گلہ کیا تھا:

> "جدید مغربی ادب نے کیوبزم کی ناکامی کے بعد سے تصوف کو اپنا لیا مگر وہاں رومانزم ختم ہوئی تو نیو رومانزم ابھی شروع ہو گئی ہے۔ ہمارے ہاں رومانزم ختم ہوئی، ترقی پسندی ختم ہوئی۔ کسی نئے رجحان یا جاندار تحریک نے جنم نہیں لیا۔ المیہ یہ ہے تو کسی کا یہ عالم ہے کہ بڑے پندرہ سال قبل جو راستے بنا گئے تھے ان پر نہایت پابندی، سعادت مندی اور فرمانبرداری سے چلا جا رہا ہے۔ ہماری اس کم مائیگی کی کچھ وجہ تو ضرور ہوگی۔ اب بغاوت کیوں نہیں کی جا رہی ہے۔ بغاوت وہ نوبت ہے جس سے مختصر کہانی کی ابتدا ہوئی۔ روایت سے باغی ہونا اور روایت کو ساتھ لے کر چلنا، ان دو دھاروں سے ادب بنتا ہے۔"(1)

قرۃ العین حیدر کی نارواضگی بجا تھی اور یہ بھی درست تھا کہ کسی نئی روایت کے آغاز کے لیے روایت سے باغی ہونا اور اسے ساتھ لے کر چلنا ہی اصل راستہ ہے لیکن یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ نئی روایت یوں نہیں پیدا ہوا کرتی۔ ظاہر ہے کہ اگر صورتحال میں یکسانیت پیدا ہو جائے یا جب نئے حالات کا سامنا ہو لیکن پرانے حربے کارگر ثابت نہ رہے ہوں تو اک ذرا دیر کے لیے جمود طاری ہو جاتا ہے۔ محمد حسن عسکری نے 1950ء میں اس ساری صورتحال کو بغور جائزہ دیکھا تھا اور اپنی ایک رائے بھی قائم کی تھی:

> "بعض اوقات ہمیں ادبی ماحول میں ایک تعطل کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تعطل اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ پچھلے پندرہ سال میں ہمارے ادب میں جو روایات اور جو فکری طریقے رائج ہو گئے تھے اور جن کے سہارے ادیب اپنا تخلیقی کام کرتے تھے ان میں سے بہت کی

چیزوں کو وہ اب پاکستان کے لکھنے والے اپنی قوم کے لیے اور خود اپنی تخلیقات کے لیے مضرت رساں سمجھنے لگے ہیں۔ اس لیے اب وہ ان پرانی روایات کے مطابق نہیں لکھنا چاہتے۔ نئے ادبی رجحانات بتدریج ہی پیدا ہوتے ہیں اور ان کے پیدا ہونے سے پہلے کچھ دن تک چھوٹے موٹے کامیاب، نیم کامیاب اور ناکامیاب تجربے کرنے پڑتے ہیں۔ ہمارے ادیب اسی تلاش اور تفتیش کے دور سے گزر رہے ہیں جو چیز ہمارے ادب کی ترقی کو روک رہی تھی وہ ہمارے ادیبوں کی ذہنی خود اطمینانی تھی۔ کم از کم یہ چیز تو اب دور ہو چکی ہے۔ ادیبوں کا اپنے آپ سے اور اپنی تخلیقات سے غیر مطمئن ہو جانا بھی نیک فال ہے۔''(2)

رومانیت کا یہ سلسلہ جو چند برس چلا بلا جواز نہ تھا۔ ترقی پسند تحریک کی سخت گیری اور فسادات کی المناکی ایسے مسائل تھے جنہوں نے ذہنوں کو رومانویت کی طرف مائل کر دیا۔ ڈاکٹر محمد حسن کا کہنا ہے:

''جب ہنگامی اور صحافتی میدان کی ناکامی نمایاں ہونے لگی تو ایسے افسانہ نگاروں کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی جنہوں نے رومانویت، آدرشی بیان اور ماورائیت کو اپنایا۔''(3)

پچاس کی دہائی میں افسانے کے میدان ہی میں تعطل کا سوال زیادہ اٹھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے افسانے کے بارے میں دی گئی ڈاکٹر محمد حسن کی رائے کا تذکرہ کیا ہے۔ اب اسی صنف کے بارے میں شہزاد منظر کی رائے ملاحظہ کیجیے:

''قیام پاکستان کے بعد لکھے جانے والے افسانوں کا موضوعات اور رجحانات کے اعتبار سے مطالعہ کیا جائے تو سب سے پہلے جو تبدیلی

Scanned by CamScanner

نظر آتی ہے وہ سیاسی موضوعات کا افسانے سے اخراج ہے۔ آزادی سے قبل جو موضوعات تھے مثلاً برطانوی استعمار کے خلاف آزادی کی جدوجہد یا حب الوطنی یا معاشرتی اصلاح اور سماجی نا انصافی کے خلاف احتجاج وغیرہ۔ اب یہ موضوعات اپنی کشش اس لیے گنوا چکے تھے کہ ملک آزاد ہو چکا تھا اور ترقی پسند تحریک کے زوال کے باعث نئے افسانہ نگاروں کے سامنے کوئی نصب العین نہیں رہا تھا۔ جس کی وجہ سے سماجی بغاوت معاشی مساوات، طبقاتی جدوجہد اور بھوک افلاس اور بے روزگاری جیسے موضوعات سے ادیبوں کی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ خصوصاً نئی نسل کے افسانہ نگاروں نے نئے موضوعات کی تلاش میں دو راستے اختیار کیے۔ ایک رومانویت کا راستہ اور دوسرا جنس نگاری۔"(4)

شہزاد منظر کی رائے سے کلی اتفاق تو ممکن نہیں اس لیے کہ سماجی معاشی اور طبقاتی انصاف کا عنصر افسانے سے غائب نہیں ہوا تھا۔ احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور حتیٰ کہ بعض دوسرے لکھنے والے مثلاً ابراہیم جلیس، شوکت صدیقی وغیرہ کے موضوعات کا محور و مرکز یہی عناصر تھے۔ البتہ برطانوی سامراج کے خلاف بنائے گئے موضوعات کا ختم ہو جانا فطری امر تھا۔ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد برطانوی سامراج سے مخاصمت کا ایک مرحلہ ختم ہو گیا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ منٹو اور ندیم بطور خاص پاکستانی پس منظر میں ابھرنے والے سیاسی منظر سے بھی اپنے افسانے میں کام لینے لگے۔ البتہ نئی نسل کے بیشتر افسانہ نگاروں کے بارے میں یہ بات درست ہے کہ ان کے ہاں موجود روایت کے خلاف ردعمل موجود تھا اور ان کی توجہ رومانویت اور جنس نگاری کی طرف زیادہ تھی اور ہم آسانی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ رومانویت کا یہ عنصر نئے حالات کی پیداوار تھا۔ یہ

Scanned by CamScanner

رومانویت محض ماضی تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کے پس منظر میں بھی نئے قومی حالات تھے جیسا کہ اس سے قبل کہا گیا کہ ترقی پسند تحریک کی سخت گیری اور فسادات کی المناکی دلخراش واقعات بھی تبدیلی کا باعث بنے۔

رومانویت کی ایک صورت ناسٹلجیا (Nostelgia) کی شکل میں بھی ظاہر ہوئی۔ ہمارے ہاں ایسے شاعر اور ادیب جو برصغیر کے ان علاقوں سے ہجرت کر کے آئے تھے جو ہندوستان میں واقع ہیں، ان کے ہاں قدرتی طور پر یادوں کا وہ سلسلہ رونما ہوا جس کا تعلق ان کے ماضی سے تھا۔ شاعری میں یوں تو بیشتر شعراء کے ہاں ناسٹلجیا مل جاتا ہے لیکن ناصر کاظمی اس کی ایک عمدہ مثال ہیں جنہوں نے جا بجا گزرے ہوئے کل کو یاد کیا ہے۔

شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں، گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہمسفر تھا مثالِ گردِ سفر گیا وہ

میں بھٹکتا پھرتا ہوں دیر سے یونہی شہر شہر نگر نگر
کہاں کھو گیا مرا قافلہ، کہاں رہ گئے مرے ہمسفر

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

دھیان کے آتش دان میں ناصر
بجھے دنوں کا ڈھیر پڑا ہے

اب وہ دریا نہ وہ بستی نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے

Scanned by CamScanner

جنہیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

شاعری میں اگر ناصر کاظمی کا ذکر کیا جا سکتا ہے تو نثر میں قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین اس کی دو بڑی مثالیں ہیں۔ جب ان اصحاب نے اپنے افسانوی ادب میں ناسٹلجیا کا ذکر کرنا شروع کیا تو ان پر کڑی تنقید بھی ہوئی تھی لیکن ہمارے لیے اہم بات یہ ہے کہ ناسٹلجیا کا لفظ ہمارے ادب میں 1947ء کی پیداوار ہے اور اس بات کو سمجھے بغیر ہم اپنے ادب میں قومی طرزِ احساس کو تلاش نہیں کر سکتے۔

"جب ہم نئے طرزِ احساس کی بات کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جن مختلف سطحوں پر ظاہر اور باطن میں تبدیلی پیدا ہو رہی ہے اور نئے اندیشے اور نئی بصیرتیں اور نئے غم جان کو لگے ہیں اور جو بھولی باتیں یاد آتی ہیں انہیں اس طرح جانا پہچانا جائے کہ ان کے بارے میں خود اپنے بارے میں نئی آگاہی پیدا ہو اور اس طرح قبول کیا جائے کہ آگاہی سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز میں گھل مل جائے۔ لیکن اس کے ساتھ بڑی دقت یہ ہے کہ نیا زمانہ تو شروع ہو جاتا ہے لیکن پرانا زمانہ ختم نہیں ہوتا وہ اس دیو کی طرح ہے جو بظاہر ہو کر بھی شہزادے کا پیچھا کرتا رہا تھا۔" (5)

ناصر کاظمی اور انتظار حسین نے ہجرت کو تہذیبی گمشدگی کے معنی میں استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح گویا یہ مؤقف اختیار کیا کہ تقسیم کے بعد ہمارے لیے ضروری تھا کہ ہم اس تہذیب و ثقافت کو رائج کرتے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی مرکزی تہذیب تھی اور جس تہذیب کا رشتہ مذہب میں پیوست ہے۔ گویا ناسٹلجیا صرف ذاتی ماضی کو یاد کرنے ہی کا نام نہیں بلکہ اپنی تاریخ کو بھی یاد کرنے کا نام ہے۔

Scanned by CamScanner

جدید ادب کے آغاز کا زمانہ تو ساٹھ کی دہائی ہی ہے جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا لیکن اپنی گفتگو میں ہم نے دیکھا کہ 1947ء کے بعد تبدیلی کا ایک عمل شروع ہو گیا تھا۔ ایسی ادبی روایات جو متحدہ ہندوستان میں مشترکہ تہذیبی و نظریاتی پس منظر میں پروان چڑھتی رہی تھیں ان کی جگہ نئی نسل نے نئے تخلیقی امکانات تلاش کرنے شروع کر دیے تھے۔ اگرچہ انہیں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ ہوئی البتہ یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ ایک نیا طرز احساس جنم لینے لگا ہے۔ پاکستانی اور اسلامی ادب کی تحریکیں اسی طرز احساس کی اپنے مخصوص نقطہ نظر سے وضاحت کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ تحریکیں زیادہ دیر برقرار نہ رہیں۔ اس لیے کہ ان کے وجود کا ایک بڑا سبب ترقی پسند تحریک تھی۔ اس کے خاتمے نے ان تحریکوں کے وجود کو بھی متزلزل کر دیا۔ ان کے فکری عناصر ہماری تنقید میں اب تک موجود ہیں۔

ساٹھ کی دہائی میں جو جدید ادب پیدا ہوا اس کے اسباب و محرکات میں ترقی پسند تحریک کا خاتمہ، نئے تخلیقی امکانات کی ضرورت، حقیقت نگاری کی سخت گیری اور نیا سیاسی ماحول سبھی کچھ شامل تھا۔ پچاس کی دہائی میں ادب پر رومانویت کی تہہ چڑھ گئی تھی لیکن 1958ء میں جب مارشل لا نافذ ہوا تو ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ نئی زبان اور نیا انداز وضع کرنے میں آسانی ہو گئی۔

جب ترقی پسند تحریک پر پابندی عائد ہوئی تو تمام ترقی پسند ادیب حلقہ ارباب ذوق کے پلیٹ فارم پر اکٹھا ہونے لگ گئے۔ دوسری طرف حلقے کے ادیب آغاز ہی سے جدت پسند تھے۔ خارجی حقائق کے بیان پر انہیں اعتراض تو نہیں تھا لیکن دروں بینی سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ علاوہ ازیں میراجی کے سبب سے نفسیات کا علم حلقے کے ادیبوں کی ادبی فکر کا تعین کرتا تھا جبکہ ترقی پسند ادیبوں کو سماجی شعور سے غرض رہی تھی۔ اب اس پلیٹ فارم پر دونوں فکری دھاروں کا اشتراک ہوا۔ اس طرح ایک نئی صورت پیدا ہونے لگی۔ سماجی شعور کی جگہ تہذیبی و نفسیاتی شعور نے حاصل کر لی جبکہ زبان و بیان کی سطح پر

Scanned by CamScanner

حقیقت نگاری کے خلاف ردعمل شروع ہوا۔

ساٹھ کی دہائی کی شناخت یہ ہے کہ شعروادب کی زبان میں بنیادی تبدیلیاں پیدا ہونا شروع ہوئیں۔ علامت، استعارہ اور امیجز برتے جانے لگے۔ کہیں یہ تبدیلی مثبت انداز سے آئی اور کہیں اس کے سبب سے ابہام پیدا ہوا۔ اس تحریک کے لوگوں کا خیال یہ تھا کہ چونکہ زمانہ بدل رہا ہے، حقائق بھی بدل رہے ہیں، صنعتی ترقی نے اسلوب زیست کو بھی تبدیل کر دیا ہے، اب زندگی کے حقائق اور انسانی ذات کی نفسی پیچیدگیوں کو مروجہ زبان کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا، اس لیے ان روایات کے ساتھ زندہ نہیں رہا جا سکتا جو ادب میں پہلے سے موجود ہیں۔

''ہماری آج کل کی زندگی جن تغیرات کو بطور اساس قبول کرتی ہے ان سے روکشی ممکن نہیں۔ جو جانا پہچانا اور مانا منوایا ہوا تھا، ریت کے ذروں کی مانند بکھر گیا ہے۔ کئی لوگ ان منتشر ذروں سے فرسودہ معاشرے کو قائم کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر رفتہ و گذشتہ اسلوب زیست کو کسی طور جینے مرنے پر مجبور کر دیا جائے تو زمانہ حال اپنے آشوب سمیت منہا کیا جا سکتا ہے۔ اپنا زمانہ چھوڑ کر کسی موہوم زمانے کی تلاش میں سرگرداں ہونا کچھ اتنی بری بات نہیں رہی۔ یہ کثیر تعداد شرفاء کی اس تلاش سے شرافت کا سکہ چلاتی ہے۔ ادھر ادھر تیرتی پھرتی ہے ورنہ کون نہیں جانتا کہ وقت حاوی ہو کر ہی رہتا ہے۔ وہ اسلوب زیست جو ہمارے آپ کے گھروں میں آ بسا ہے، اجنبی ہے نہ غیر حقیقی زندہ و توانا ہے۔ اس کی گمبھیرتا اس واویلے سے بھی متعین ہوتی ہے جو اس کے خلاف برپا ہے۔ روزانہ ایسے خیر سے اور ثقہ بزرگ کچھ نہ

Scanned by CamScanner

بلکہ گھٹتے ہی ہیں۔ بڑے عرصے سے کچھ نئے ہیں کر پاتے نہیں
پائے۔ نیا اسلوب نہایت بڑی تیز رفتاری سے بڑھتے چلا آ رہا
ہے۔ روکے سے رکتا نہیں۔ تبدیل کرنے سے تبدیل نہیں ہوتا۔ اپنی
مت کا پکا ہے جیسے چاہتا ہے ویسا ہوتا ہے۔" (6)

ساٹھ کے جدید ادیبوں نے جب اپنے ہاں انقلابی تبدیلی کی ضرورت کو محسوس کیا تو مغرب سے اس کی مثالیں پیش کیں۔ مغرب میں پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان کئی طرح کی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ صنعتی ترقی کا عمل انیسویں صدی میں شروع ہو گیا تھا۔ اس نے کئی طرح کے افکار پیدا کیے۔ یہ افکار بالخصوص بیسویں صدی کے آغاز پر ہمارے ادب میں داخل ہوئے اور جوں جوں ہمارا ادب ترقی کرتا گیا مغرب کی تمام تحریکات، علوم اور ادبی تبدیلیاں ہمارے ادب کا حصہ بنتی چلی گئیں۔ عزیز حامد مدنی نے اپنی کتاب "جدید اردو شاعری" میں اس کی تفصیل بیان کی ہے

"پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان کی مدت میں رومانی عہد کے شعراء انگریزی ورڈزورتھ، شیلی، کیٹس اور بائرن بلکہ بعد میں ٹینی سن اور میتھیو آرنلڈ کے اثرات بھی اردو شاعری میں آ گئے اور جوش و فراق کے دور میں یہی اثرات غالب تھے۔ اس دور میں یورپ میں متضاد تہذیبی اور سیاسی نظریے بھی پیدا ہوئے۔ اسی دور میں انقلاب روس بھی ہوا ہے۔ مارکسی فکر کے اثرات بھی بڑھتے چلے گئے۔ اسپین میں خانہ جنگی ہوئی۔ اس دور میں مغرب کا ادبی افق بدلتا چلا گیا۔ فرانسیسی، اینگلو سیکسن اور جرمن، اطالوی اور ہسپانوی ادیبوں کی تخلیقات میں اپنی تاریخ و تہذیب کے پس منظر میں علامت نگاری، امیجسٹ اسکول، ڈاڈازم اور سرئیلزم کی تحریکیں

Scanned by CamScanner

تک آئیں اور ان کے اثرات کا دائرہ بھی باہر کے ادیبوں پر ملتا ہے۔ خود ہماری شاعری نے علامت نگاری اور امیجسٹ اسکول کو قبول کیا۔ اس دور میں فکری اعتبار سے ہماری توجہ برطانوی امپیریلزم کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار پھینکنے کی تھی اور ساتھ ہی اپنی تہذیب کی ازسر نو تعمیر کی طرف تھی۔ ہم نے اس عہد میں تاریخی عوامل کے وہ زاویے جو سوشلزم میں موجود تھے، قبول کیے اور جدید مفکرین اور سائنس دانوں کی نئی تخلیقات کے اثرات بھی قبول کیے۔ 1930ء سے 1974ء تک ہمارے شعراء نے یورپ اور امریکا کی ادبی تحریکوں کا مطالعہ کیا اور مغرب کے بڑے ادبا و شعرا کے اثرات بھی ہمارے یہاں آئے۔ بلکہ انگریزی، امریکی، روسی اور فرانسیسی اہم شعراء میں جو اس دور میں لکھ رہے تھے ہم نے ان کی فکر، اسلوب و ہیئت کو بھی اپنے معاشرے کے تغیرات کی ترجمانی کے لیے سامنے رکھا۔"(7)

یہ بات واضح ہو گئی کہ مغرب میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیاں ہمارے ادب میں بھی داخل ہوئیں اور یہ سب تبدیلیاں تقلید برائے تقلید نہیں تھیں بلکہ ان کی مدد سے اپنے معاشرے کے تغیرات کو بیان کرنا بھی تھا۔ جب افتخار جالب وغیرہ نے روایت سے انحراف کیا تو ان کا موقف یہی تھا کہ چونکہ معاشرہ نئی تبدیلیوں میں مبتلا ہو رہا ہے لہٰذا اس کے اظہار کے لیے نئے وسائل اور ذرائع کی ضرورت ہے جو پرانے انداز فکر اور پیرایۂ اظہار کے ذریعے ممکن نہیں۔ ساٹھ کی دہائی میں پہلی تبدیلی نظم میں آئی۔ افتخار جالب، جیلانی کامران، محمد سلیم الرحمٰن، عباس اطہر، جون ایلیا اور بے شمار دوسرے شاعروں نے نئے موضوعات اور نئی لفظیات کو فروغ دیا اور ایک نئی طرز فکر کا منظر نامہ پیش کیا۔ جدیدیت

Scanned by CamScanner

کا جو تصور نظم میں آیا تھا وہ جلد ہی افسانے میں بھی دکھائی دینے لگا لیکن ابتدائی عہد میں شعروادب کی تبدیلیاں تجرباتی سطح پر تھیں اور نفسیاتی جبر کا اظہار بھی کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے ادب میں فردیت کا تصور بھی پیدا ہوا۔ اس کا مطلب انفرادی آزادی ہے۔ یہ تصور بھی مغرب سے آیا ہے۔ ترقی پسند تحریک اجتماعی زندگی کو موضوع بناتی تھی جبکہ ساٹھ کی دہائی کے ادیبوں نے فرد کی ذات کو سب سے اہم اور مقدم قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری میں نفسی پیچیدگیوں کا بہت ذکر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جنسیات کا بھی ذکر ہمیشہ سے زیادہ ہے۔ ذات کی یہ آزادی مغرب کی نئی شعری روایت تھی جو کسی منشور یا لائحہ عمل کی پابند نہ تھی۔

> "اصل یہ ہے کہ جب سائنس کی تیز رو ترقیوں نے مستحکم عقائد کو بھی تہس نہس کر کے رکھ دیا تو شاعروں اور ادیبوں کے پاس ایسا کوئی عقیدہ نہ رہا جو اس کے (فرد کے) پورے وجود کو کسی مقصد سے ہم کنار کر سکے۔ اس لیے اسے کسی جماعت اور پیام سے دلچسپی نہ رہی۔ اس نے فلسفہ سیاست، مذہب اور اخلاق کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی اور اپنے پہلوں کی طرح خدا، کائنات اور حیات کی گتھیاں سلجھانے کے بجائے اپنی ذات کے عرفان کی کوششوں میں محو ہو گیا۔"(8)

ترقی پسند ادیبوں نے فردیت کو ہمیشہ فرار کا عمل قرار دیا ہے لیکن ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ فردیت کا تصور آزادی کا تصور ہے جو جمہوری معاشروں کی پیداوار ہے۔ گویا فردیت نفسیاتی بیماری نہیں بلکہ آزادی کی خواہش اور ضرورت ہے۔ فردیت کا تصور جدید ادب میں اس لیے بھی آیا ہے کہ نئے ادیبوں نے فلسفۂ وجودیت سے بھی گہرا اثر قبول کیا۔ یہ فلسفہ شدید تنہائی، دہریت، شکست اور انانیت کو پیدا کرتا ہے جو فردیت کی بنیادیں ہیں۔

''وجودیت کے اثر یا منطقی نتیجے کے طور پہ انانیت اور خود بینی اور
تنہائی کی شدت بھی شدید ہوئی اور وہ بھی نئی شاعری کے خواص کا
حصہ بن گئی۔ ''میں'' کی اس شدت نے ہر شے کو حقارت کی نظر سے
دیکھا صرف اپنی بصیرت کو رہبر مانا جس سے معاشرے سے برگشتگی
کی لے اور تیز ہو گئی۔''(9)

ساٹھ کی دہائی میں جب جدیدیت نے جنم لیا تو اس کے اسباب میں ترقی پسند تحریک کا ردعمل، نئی مغربی تحریکات و نظریات کا اثر اور زندگی کے بدلتے رویے اور اقدار تھے۔ جدیدیت کے اس رویے نے اسلوب کی سطح پر بہت سی تبدیلیاں پیدا کیں۔ فکر میں کہیں کہیں انتشار پیدا کیا لیکن مستقبل بینی کا رویہ بھی پیدا ہوا۔ ادب کی جدید تکنیکوں اور پیرایہ ہائے اظہار کو آغاز میں آسانی سے قبول نہیں کیا گیا۔ پرانی نسل کے لوگوں نے اسے فراریت، انانیت اور فردیت قرار دیا لیکن اس کے اسباب پر غور نہیں کیا۔ نئی مملکت، نئے مسائل اور نئے موضوعات کو یقیناً ایک نئے انداز نظر اور پیرایۂ اظہار کی ضرورت تھی۔ یہاں اس بات کو نظر انداز کرنا بھی مناسب نہیں ہو گا کہ ایک بڑا عامل 1958ء کا مارشل لا بھی تھا۔ اس مارشل لا نے آزادیٔ اظہار پر قدغن لگائی تو بیانیہ اور حقیقت نگاری کا رویہ کمز... خور پر بیکار ہو گیا۔ اس میں کئی طرح کے اندیشے تھے۔ اس نے بھی علامت، امیج اور نئے فنی وسائل کو شعروادب میں جگہ بنانے کی سہولت فراہم کی۔ ڈاکٹر رشید امجد کہتے ہیں:

''مارشل لا کے اثرات آہستہ آہستہ سرایت کر کے معاشرے کی اندرونی
پرت تک پہنچ گئے۔ خوف اور بے سمتی کی فضا نے داخلیت اور نئی
مابعد الطبیعیاتی فکر کو جنم دیا۔ دوسری شخصیت کی دریافت، باطنی شکست و
ریخت، ایک شخصیت میں کئی شخصیتوں کی تلاش اور مجمع میں تنہائی کا
احساس نمایاں موضوع بن گئے۔ ستمبر 1965ء میں قومی شناخت کا

Scanned by CamScanner

ایک نیا مرحلہ شروع ہوا۔ اس جنگ نے وطن پرستی اور زمین کی اہمیت کے جذبوں کو بیدار کیا۔ دفاعِ پاکستان کے حوالے سے ایک نیا موضوع سامنے آیا جس کا زیادہ عمدہ اظہار شاعری میں ہوا۔ خصوصاً نظم میں 1968ء کی عوامی تحریک نے نظریاتی بحث کو دوبارہ تازہ کر دیا اور نو ترقی پسندی کی اصطلاح مقبول ہونے لگی۔ فرد کی بجائے اجتماع اور خارج کی باتیں ہونے لگیں۔ لیکن یہ پرانی حقیقت نگاری کی تجدید نہ تھی بلکہ خارجی حقیقت نگاری اور باطنی دروں بینی کا ایک نیا امتزاج تھا جسے ستر کی دہائی کی نسل نے آگے بڑھایا۔"(10)

رشید امجد نے 1958ء کے مارشل لا کے اثرات کے ساتھ جدید ادب کے آغاز کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ خوف اور بے سمتی نے داخلیت کو جنم دیا اور یہی داخلیت ساٹھ کی دہائی کے نئے ادب کی شناخت ہے جسے آگے چل کر 1965ء کی جنگ نے ایک نئی شکل دی۔ نئے ادب پر اس جنگ کے اثرات یہ ہیں کہ اس کی وجہ سے ہمارا ادیب زمین اور وطن کی اہمیت اور محبت سے سرشار ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس جنگ کے زمانے کے بعد سے لسانی مباحث میں کمی واقع ہو گئی اور قومی موضوعات کی اہمیت بڑھ گئی۔ 1968ء میں جب ایوب خان کے مارشل لا کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو شعر و ادب میں سے فردیت کا تصور مٹ گیا۔ اجتماعی زندگی کا تصور پیدا ہوا۔ جمہوریت اور آزادی اور ظلم و استحصال کے خلاف فکر نے کروٹ بدلی۔ اسی لیے یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ ستر کی دہائی کا ادیب اپنے گرد و پیش اور اپنی زمین سے زیادہ قریب ہے۔ ستر کی دہائی میں جو نئی نسل سامنے آئی وہ اپنی نفسی پیچیدگیوں میں مبتلا نہیں تھی اور نہ ہی فلسفۂ وجودیت کی طرف مائل تھی۔ بلکہ ستر کی دہائی میں ہمارا ادب اپنے گرد و پیش اور خارجی حقائق کو اپنا موضوع بناتا ہے۔

Scanned by CamScanner

زبان و بیان میں جو تبدیلیاں ساٹھ کی دہائی کے جدید ادیبوں نے لانی شروع کی تھیں ان کا عمل ستر کی دہائی میں سست نہیں پڑا بلکہ اس میں ایک حد تک اضافہ ہی ہوا ہے۔ لیکن ان تبدیلیوں کا تعلق بہرحال اجتماعی زندگی اور خارجی حقائق کے ساتھ تھا۔ یہ دہائی ہماری قومی زندگی میں اس لیے اہم ہے کہ اس میں ہر لمحہ نئے سانحات اور واقعات پیدا ہو رہے تھے۔ صورتحال اتنی گمبھیر اور پیچیدہ تھی کہ اس کو بیان کرنے کے طریقۂ کار میں بھی پیچیدگی کا داخل ہو جانا قدرتی امر تھا۔ وہ عوامی تحریک جو 1968ء میں شروع ہوئی، فوری طور پر کسی مثبت نتیجے پر ختم نہیں ہوئی۔ ریاستی مشینری اور عوامی جوش و جذبے کا تصادم روزمرہ کا معمول بنا اور اس کے نتیجے میں ایک مارشل لا ختم ہوا اور دوسرا نافذ ہوا۔ 1970ء میں انتخابات ہوئے مگر عوامی اسمبلیاں بر نہ آئیں اس لیے کہ مشرقی پاکستان میں آزادی کی تحریک نے ملک میں دونوں بازوؤں میں سیاسی رسہ کشی اور تصادم کو جنم دیا۔ 1971ء میں سقوط ڈھاکہ کا واقعہ پیش آیا اور یوں ایک ایسا قومی المیہ پیدا ہوا جس نے نئی نسل کے مزاج میں شکست اور ہزیمت کو سرایت کر دیا۔ نہ صرف یہ کہ اجتماعی زندگی خلفشار کا شکار ہوئی بلکہ شعروادب میں بھی نیا رویہ پیدا ہوا۔

اس رویے میں ابھی توازن و اعتدال نہ تھا۔ شکست و ہزیمت نے ذہنوں کو پراگندہ کر دیا تھا۔ کئی طرح کے تشویشناک سوالات تھے جن کا کوئی جواب دستیاب نہ تھا۔ سفرنامہ نگار محمد کاظم نے مغربی جرمنی میں اس دکھ کو محسوس کیا اور اپنی ذہنی کیفیت کو اس طرح بیان کیا

"اس جنگ کے نتیجے میں ہم تاریخ کے جس افسوسناک ترین المیے میں سے گزر کر آئے ہیں اس نے مزاج اور ذہن کو ایک اور طرح سے خارج المرکز کر رکھا ہے۔ دماغ میں ایک بھٹی سی تپی ہوئی ہے جس میں طرح طرح کے سوال بھاپ بن کر اٹھتے ہیں اور کوئی جواب نہ پا کر ذہن کی دیواروں سے سر پٹک کر رہ جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں

کوئی صحیح الخیال آدمی زمانہ امن و مسرت کی داستان کیسے سنا سکتا ہے
اور اگر وہ سنانے پر اپنے آپ کو آمادہ بھی کر لے تو کون ہوگا جو اس
بے وقت راگنی پر اپنے کان دھرے گا۔ ابھی جذبات برانگیختہ ہیں......
اور سوچ و فکر کا توازن بگڑا ہوا ہے۔" (۱۱)

سقوط ڈھاکہ کے اثرات پاکستانی ادب پر بہت نمایاں ہیں۔ شاعری بھی اس سے متاثر ہوئی اور افسانے بھی۔ شاعری میں کیفیت اور تاثر کا عمل دخل زیادہ ہے جبکہ افسانے میں واقعات بکھرے ہوئے ہیں۔ ڈھاکہ میں موجود افسانہ نگاروں مثلاً غلام محمد، شہزاد منظر، علی حیدر ملک، ام عمارہ، عمر خیام اور شام بارک پوری وغیرہ کے ہاں وہ داستانیں بکھری ہوئی ہیں جو ان کے گردوپیش میں جنم لے رہی تھیں۔ مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) میں انتظار حسین، مسعود اشعر، رشید امجد اور بعض دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں بھی شکست کا شدید احساس موجود ہے۔ جن دنوں سقوط ڈھاکہ کا واقعہ پیش آیا اس وقت پاکستانی افسانے میں جدیدیت کی تحریک عروج پر تھی۔ بنگلہ دیش کے قیام نے جو نیا جذباتی ہیجان پیدا کیا اس نے افسانے کے اسلوب میں نت نئی تبدیلیاں پیدا کرنے کا ایک نیا راستہ کھول دیا۔ سقوط ڈھاکہ نے جہاں احساس شکست کو جنم دیا تھا وہاں باقی ماندہ پاکستان کے بارے میں تشویش کو بھی ابھارا تھا۔ یہی خوف اور تشویش مختلف علامتوں کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔ ممکن ہے یہ عناصر رفتہ رفتہ ناپید ہو جاتے لیکن 1977ء کے مارشل لا نے شکست و ہزیمت اور تشویش کے عناصر کو مسلسل قائم کیے رکھا۔ اگرچہ رشید امجد نے اپنے ایک مضمون میں اس چھوٹے سے وقفے کا مناسب تجزیہ کیا ہے جو جمہوری آزادی کے ساتھ آیا اور پھر مارشل لا کی نذر ہو گیا:

"سقوط ڈھاکہ نے مجموعی مایوسی کو گہرا کر دیا لیکن جمہوریت کے آغاز
اور پہلی بار ایک متفقہ آئین نے چند ہی برسوں میں پرانے زخموں پر

Scanned by CamScanner

مرہم کاری کا عمل شروع کر دیا۔"(72)

پاکستان میں اردو ادب کے تخلیقی پس منظر میں سیاسی عناصر بہت نمایاں رہے۔ آغاز میں ہم نے دیکھا کہ فسادات، ہجرت اور مہاجرین کی آباد کاری کا افسانے پر گہر ہے۔ 1958ء کے مارشل لا نے بھی اپنے اثرات چھوڑے۔ 1965ء کی جنگ کا بھی ذ ہوا۔ جبکہ سقوطِ ڈھاکہ نے تو ادب میں بہت سی بنیادی تبدیلیاں پیدا کیں۔ پاکستان اور ی سے جمہوری آزادیوں سے محروم کر دیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب 1968ء میں ایو تحریک کا آغاز ہوا اور اس تحریک کے نتیجے میں ملکی منظر تک آئی جس نے کامل اتفا سے آئین منظور کیا تو ہر چند کہ سقوطِ ڈھاکہ نے مزاجوں میں مردنی پیدا کر دی تھی شعر و ادب میں خوشگوار یہ منظر بھی جنم لینے لگا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک برقرار نہ کا اور 1977ء کے مارشل لا سے ایک اور بحران کے سبب زاویے جو سقوطِ ڈھاکہ کے ساتھ پیدا ہوئے تھے دوبارہ ابھر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ 1977ء کے بعد جہاں ایک ایسا مزاحمتی ادب پیدا ہوا جو بلاواسطہ اس حکومت کو اپنا ہدف بناتا تھا جو اس وقت موجود تھی و دوسری طرف ادب کی ایک مخفی صورتحال تھی جس میں لکھنے والا ہر حساس ادیب کی طرح کے اندیشوں میں گھرا تھا۔ سب سے بڑا اندیشہ قومی سلامتی کے متعلق لاحق تھا۔ مارشل لا کی آمد کے بعد سیاسی قائدوں کے باہمی تصادم کی فضا نے تذبذب کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ سقوطِ ڈھاکہ کا واقعہ پیش آ چکا تھا اور اب باقی ماندہ پاکستان کی سلامتی داؤ پر لگی دکھائی دیتی تھی۔ اس زمانے کی شاعری اور بالخصوص غزل میں اس عہد کی کیفیت کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے:

زمیں ہم سے تری بے بسی دیکھی نہیں جاتی
کہاں دریا بہائیں گے کہاں باغات رکھیں گے

(ثروت حسین)

گھر کے جلنے کا غم تو ہوتا ہے
اپنے جلنے پہ کون روتا ہے

(پروین شاکر)

سانپ نے ان کے نشیمن میں بسیرا کر لیا
پیڑ سے چڑیوں کی چہکاریں فضا میں کھو گئیں

(گلزار بخاری)

سوچ میں ڈوبا دکھائی دے، تھکا ہارا ملے
اب جسے دیکھو وہی خدشات کا مارا ملے

(شفیع ضامن)

عمر بھر خون سے سیراب کیا ہے جس کو
ہائے اس پیڑ کی شاخوں پہ ثمر کوئی نہیں

(سبطِ علی صبا)

سورج تو جل بجھا ہے افق کے الاؤ میں
پرچھائیوں کی راکھ ہے میرے مکان پر

(یوسف حسن)

تھک گیا ہوں کوئی سایہ بولے
تشنہ لب ہوں کوئی دریا بولے

(منظور عارف)

صبح کی چاہ میں پتھرائی گئیں میری آنکھیں
ایک آزار مجھے دیدۂ بیدار ہوا

(خالد احمد)

جب اک بے یقینی کی فضا ہے
یہاں ہونا نہ ہونا ایک سا ہے

(صابر ظفر)

کہیں لہو کہیں دامن کہیں گریباں سے
تمام راستے کانٹوں نے گل کھلائے ہیں

(سلمان رضوی)

1977ء کے بعد غزل کے موضوعات میں قومی پس منظر بڑی وضاحت کے ساتھ اپنی چھب دکھاتا ہے۔ یوں دیکھیے تو اس عہد کی غزل مجموعی طور پر اپنی زمین اور اپنی سماجی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ پروفیسر یوسف حسن نے ستر کے بعد سامنے آنے والی نسل کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"1972ء سے 1977ء تک کے جمہوری دور میں اس نسل میں مجموعی طور پر حقیقت پسندی ہی فروغ پاتی رہی اور جب حکمران طبقوں نے اپنے قومی اور عوامی وعدوں سے انحراف شروع کیا اس کے خلاف ردِ عمل اس نسل کی غزل میں بھی آیا۔ پھر 1977ء-88ء کے ظلمت پرست مارشل لا نے ساری صورتحال بدل کر رکھ دی۔ اس طویل مارشل لا میں قتلِ جمہوریت کے ساتھ ساتھ مذہبی تنگ نظری کو بھی پھیلایا گیا۔ سابق منتخب وزیرِ اعظم کو تختہ دار پر چڑھایا گیا اور ہزاروں جمہوریت پسندوں اور عوام دوستوں کو قید، کوڑوں اور بیروزگاری کی سزائیں دی گئیں۔ اسی دور میں نئی نسل کے کچھ شعرا عسکری آمریت کے ہمراہ ہو گئے۔ کچھ انسانیت سے منقطع تصوف اور سریت کی طرف جھک گئے اور بعض نے قرونِ وسطیٰ کی مسلم ملوکیتوں کی مجلاتی فضا سے

Scanned by CamScanner

تخیلی لذت کشی کا رویہ اختیار کیا۔ تاہم ایک بڑی تعداد اپنے فن یا عمل اور فن دونوں سے مجبور بہت پسند تو توں کے ساتھ رہی۔''(13)

جو صورتحال شاعری کی ہے وہی صورتحال افسانے کی بھی ہے۔ علامتی ادب کے باب میں ہم نے چند مثالیں پیش کی تھیں۔ قومی زندگی اور زمین کے ساتھ افسانہ نگاروں کے کیسے جذبے وابستہ ہو گئے تھے اس کی چند مثالیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ انتظار حسین کے ایک افسانے کا اقتباس ملاحظہ کیجیے

''کیا تو نے دیکھا جو لوگ اپنی زمین سے بچھڑ جاتے ہیں پھر کوئی زمین انہیں قبول نہیں کرتی۔ میں نے یہ دیکھا اور جانا کہ ہر زمین ظالم ہے جو زمین جنم دیتی ہے وہ بھی اور جو زمین دارالاماں بنتی ہے وہ بھی۔''(14) (قصہ کہانیاں)

علامتی افسانے میں رشید امجد کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے لیے ایک اسلوب وضع کیا ہے۔ اس اسلوب کی شناخت بے یقینی کی اس کیفیت کے ساتھ ہوتی ہے جو ستر کی دہائی میں انہیں مسلسل لاحق رہا۔ یہ کیفیت ہمیں ان سیاسی واقعات سے بھی آشنا کرتی ہے جن میں تشویش کے کئی پہلو تھے۔

''سنسان دبیز خاموش سناٹا اس کے گرد کنڈل مارے بیٹھا ہوا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ دق کے مریض کی طرح ٹھہر ٹھہر کر کانپ کانپ کر قبر کے سرہانے کھانس رہا ہے۔ (تو یہ میری قبر ہے) اداسی احاطے میں بوند بوند ٹپک رہی ہے۔''(15) (پت جھڑ میں خود کلامی)

رشید امجد کے ہاں مردہ، قبر، سناٹا، تاریکی ایسی علامتیں ہیں جو شناخت کی گمشدگی تھی۔ رشید امجد نے اپنے افسانوں میں بارہا اس گمشدگی کو ابھارا ہے۔

''میں میں۔ وہ چیخا

Scanned by CamScanner

مگر فوراً ہی خیال آتا ہے کہ میں کون ہوں؟

نام بے نشان بے پہچان

لفظ بے معنی بے چہرہ"(16)

(بند ہوتی آنکھ میں ڈوبتے سورج کا عکس)

"قدموں کے نشان شہر کی ناف تک تو آتے دکھائی دیتے ہیں، آگے پتا نہیں چلتا۔ بس ایک خرانٹ لیٹا سناٹا ہے جو چوکڑی مارے بیٹھا ہے اور وہ قافلے سے بچھڑ گیا ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ اکیلا کھڑا سوال پہ سوال کیے جا رہا ہے۔ سنسان سڑکیں اور ویران گلیاں اس کے سوال سن کر ہٹر ہٹر دیکھتی ہیں اور اپنی خالی جھولیاں اس کے آگے الٹ دیتی ہیں۔"(17) (قافلے سے بچھڑا غم)

احمد جاوید کا شمار بھی ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے ستر کی دہائی میں سیاسی جبریت سے گہرا اثر قبول کیا اور پاکستان کے مخصوص پس منظر میں اپنی شدید بے چینی کو علامتوں کے ذریعے ظاہر کیا

"مجھے کوئی دعویٰ نہیں، میں سیدزادہ نہیں نہ سہی، میرے آباؤاجداد نجف و بخارا سے نہیں آئے۔ چلو نہیں آئے۔ بکرماجیت اور بیتال بھرم میری کہانی نہیں۔ نہ سہی۔ یہ میری تاریخ نہیں نہ سہی۔ مجھے کوئی دعویٰ نہیں۔ میں وہ سہی جسے تم دھکیلتے ہوئے ہانپتے ہوئے اپنے گلے کے باڑے میں لے آئے"(18) (کولہو کے بیل)

"زمین اپنے اندر جھکتی جاتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ عظیم تہذیبوں کو تو اس لیے زوال آتا ہے کہ تاریخ میں رقم ہو جائیں اور خوبصورت اور کشادہ شہر اس لیے زمین میں دھنستے ہیں کہ آنے والوں کی تکریم کے

لیے محفوظ ہو جائیں مگر میں جس کی گلیوں میں بھاگتا ہوں وہ کیوں دھنستا جا رہا ہے۔ یہاں تو کوئی بُرج نہیں، گنبد نہیں، مینار نہیں۔ گھروں کے دروازوں پر بوسیدہ پیوند لگے ٹاٹ کے پردے اور بے رنگ و روغن کواڑ کی کھڑکیاں اور جھکی ہوئی منڈیریں، کائی زدہ دیواروں کا اکھڑا ہوا پلستر اور جھولتی ہوئی ممٹیاں''(19) (پیادے)

ان چند مثالوں کے علاوہ اس عہد کے بیشتر افسانہ نگاروں کے ہاں اسی نوعیت کا ردِعمل، تاثر اور کیفیات موجود ہیں جن سے صورتحال کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور تخلیقی فنکاروں کے شعور میں موجود قومیت کا شدید احساس بھی سامنے آتا ہے۔ شاعری اور افسانے کی طرح اس عہد کے ناولوں کا بھی یہی پس منظر ہے۔ پاکستان میں ناول نگاری کی صنف کی طرف بہت کم توجہ رہی ہے لیکن تقسیم ہند کے بعد سے جس قدر بھی ناول لکھے گئے ان میں سیاسی و سماجی پس منظر ہی بنیادی موضوع فراہم کرتا ہے۔

''آگ کا دریا'' (قرۃ العین حیدر)، ''اداس نسلیں'' (عبداللہ حسین)، ''آنگن'' اور ''زمین'' (خدیجہ مستور)، ''خدا کی بستی'' (شوکت صدیقی) وغیرہ کا پس منظر پاکستان کا قومی منظر نامہ ہے۔ ساٹھ کی دہائی کے بعد علامتی ادب کے آغاز پر بھی جو چند ناول لکھے گئے ان میں سے قابلِ ذکر ناولوں کے موضوعات میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ ''بستی'' (انتظار حسین)، ''خوشیوں کا باغ'' (انور سجاد)، ''راکھ'' (مستنصر حسین تارڑ) اور ''دیوار کے پیچھے'' (انیس ناگی) پاکستانیت کے شعور کی نمائندگی کرتے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد پاکستانی ادب میں سماجی و سیاسی موضوعات کا غلبہ رہا ہے۔ ابتدائی برسوں میں تقسیم، ہجرت، وغیرہ جیسے مسائل نمایاں تھے جبکہ 1958ء کے بعد مارشل لاؤں کے ردِعمل، سقوطِ ڈھاکا کے اثرات، پاکستان کی قومی سلامتی کو لاحق خطرات، جمہوری آزادیوں کی خواہش وغیرہ جیسے موضوعات تمام تر ادب کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ ستر کی دہائی

Scanned by CamScanner

سے اسی کی دہائی کے وسط تک عام طور پر علامتوں کے نظام میں بھی پاکستانیت کا شعور ہی کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یوں یہ بات کہنے میں ہمیں سہولت حاصل ہے کہ پاکستانی ادب میں جدیدیت کی جو لہر آئی وہ محض مغربی ادب کی تقلید نہ تھی بلکہ ہمارے ادیبوں نے جو علامتیں وضع کیں اور جو اسلوبیاتی تجربے کیے ان کے پس پشت اپنی ثقافتی اقدار، سماجی انصاف، جمہوری آزادیوں کی خواہش اور قومی سلامتی سے محبت جیسے عناصر موجود تھے۔ اس طرح ہمارا جدید ادب واقعتاً پاکستانیت کے شعور کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ قرۃ العین حیدر، کیا موجودہ ادب رو بہ زوال ہے، نقوش لاہور، ادارہ فروغ اردو، دسمبر 1958ء

2۔ محمد حسن عسکری، کچھ اپنی باتیں (اداریہ)، ماہ نو، کراچی، مئی 1950ء

3۔ محمد حسن، ڈاکٹر، اردو افسانہ 1948ء کے بعد، شعور، کراچی، مکتبہ شعور، شمارہ 5

4۔ شہزاد منظر، پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال، ص 104

5۔ انتظار حسین، علامتوں کا زوال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1983ء، ص 46

6۔ افتخار جالب، ماخذ، ص 30-29

7۔ عزیز حامد مدنی، جدید اردو شاعری (حصہ دوم)، انجمن ترقی اردو، پاکستان، طبع اول، 1994ء، ص 273,272

8۔ منظر اعظمی، ڈاکٹر، اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، اتر پردیش اکادمی، لکھنؤ، 1996ء، ص 536

9۔ ایضاً، ص 541

10۔ رشید احمد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے نمایاں رجحانات، مشمولہ عبارت، راولپنڈی، ص 23

Scanned by CamScanner

11۔ محمد کاظم، ایک سفر سے واپس آ کر، مشمولہ فنون، لاہور، دسمبر 1971ء، ص 8
12۔ رشید امجد، ڈاکٹر، شاعری کی سیاسی و فکری روایت، وستاویز مطبوعات، لاہور
13۔ یوسف حسن، پاکستان میں اردو غزل کے پچاس سال، مشمولہ عبارت، ص 75
14۔ انتظار حسین، قصہ کہانیاں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص 388
15۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پت جھڑ میں خودکلامی، اثبات پبلی کیشنز، راولپنڈی، ص 35
16۔ ایضاً، ص 43
17۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پت جھڑ میں خودکلامی، اثبات پبلی کیشنز، راولپنڈی، ص 54
18۔ احمد جاوید، غیر علامتی کہانی، خالدین، پوسٹ بکس 1197، لاہور، بار اوّل، 1983ء، ص 56,57
19۔ ایضاً، ص 61

Scanned by CamScanner